مولانا مفتی محمد زاہد

شیخ الحدیث جامعہ امدادیہ۔ فیصل آباد

پہلی بات جو اگرچہ براہِ راست موضوع سے متعلق نہیں، لیکن پروگرام کے مقاصد سے اس کا گہرا تعلق بنتا ہے، ایک تجویز کے طور پر پیش کر رہا ہوں اور وہ یہ کہ تربیت اساتذہ کے ساتھ ساتھ مہتمم حضرات اور مدارس کے منتظمین کی تربیت کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔ اسے گستاخی نہ سمجھا جائے، یہ اس لیے ضروری ہے کہ ایک اچھا مدرس برے حالات میں بھی اپنا کام نکال لیتا ہے، اور اگر نصاب اچھا ہو، اور ادارے کا عمومی ماحول جو انتظامیہ نے فراہم کرنا ہے، وہ سازگار ہو تو اس کی کارکردگی بہت زیادہ بہتر ہو جاتی ہے۔ اگر آپ ایک استاد کو ملٹی میڈیا، پروجیکٹر، کمپیوٹر اور اسی طرح کے جدید وسائل کے استعمال کی تربیت دے بھی دیں تو جب وہ تربیت کے بعد مدرسے واپس جائے گا اور وہاں مہتمم صاحب کا تصور یہ ہوگا کہ کلاس میں تختہ سیاہ لگانا بھی اسراف اور پیسے کا ضیاع ہے، چناں چہ اس کی ضرورت نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ تربیت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، یہ نچلی سطح پر منتقل نہیں ہو سکے گی۔

یہ مسئلہ صرف تکنیکی وسائل تک ہی محدود نہیں ہے۔ درحقیقت اچھی تدریس کے کچھ لوازمات ہوتے ہیں، کچھ ماحول درکار ہوتا ہے اور کچھ سہولیات درکار ہوتی ہیں۔ ہم ایک استاد کو یہاں بلا کر تربیت دیتے ہیں اور اسے متوجہ کرتے ہیں کہ اپنی کارکردگی اچھی بنانے کے لیے مطالعہ ومہارت کا انتظام کرو، اپنے موضوع کے متعلق تمہیں معلومات کا احاطہ ہونا چاہیے۔ اس موضوع پر جتنی جدید ترقی اور ابحاث ہوئی ہیں، ان کے بارے میں تمہیں جاننا چاہیے۔ لیکن اگر ادارے میں اسے اچھی لائبریری دست یاب نہیں، معلومات تک رسائی کا بہتر انتظام نہیں ہے تو مدرس نے تربیت کے دوران جو جذبہ اور شوق حاصل کیا ہے، کچھ عرصہ برقرار رہے، پھر یا تو وہ مہتمم سے ٹکراؤ کا سبب بنے گا یا پھر اس کا جذبہ بہ تدریج سرد ہو جائے گا۔ اس لیے اہل انتظام کے حوالے سے بھی کچھ سوچ بچار ہونی چاہیے۔ اگر ان کو اس کی افادیت سمجھا دی جائے کہ مدرسے کو اور خود انفرادی سطح پر آپ کو یہ فائدہ پہنچے گا اور مدرسے میں اس اس پہلو سے بہتری آئے گی تو وہ بہت آسانی سے ایسی سرگرمیوں کی طرف راغب اور آمادہ ہو سکتے ہیں۔

ایک اور چھوٹی سی تجویز عرض کرتا ہوں، جس پر اہل مدارس کو مل جل کر غور کرنا چاہیے، انفرادی طور پر شاید کوئی مدرسہ یہ نہ کر سکے۔ یہ مدارس کی بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ طلبہ کو تعلیم بھی مفت فراہم کرتے ہیں اور تعلیم کے علاوہ کھانا، قیام، علاج معالجہ، کتابیں اور بہت سی سہولیات مفت فراہم کرتے ہیں۔ یہ یقیناً ہمارے مدارس کی بہت بڑی خوبی ہے۔ ایک وقت تھا کہ صرف غریب طلبہ ہی مدارس کی طرف آتے تھے، لیکن اب متوسط طبقے کی ایک بڑی تعداد اپنے بچوں کو مدارس کی طرف بھیج رہی ہے، تو جس طرح کی اور جس سطح کی مفت خوری کا ہم انہیں عادی بناتے ہیں، کیا واقعتاً آج کے ماحول میں اس کی ضرورت ہے یا یہ مناسب ہے؟ یا ہمیں اس پر نظر ثانی کرنی چاہیے؟ میرا خیال ہے کہ اگر ایک آدھ مدرسہ اس سلسلے میں کچھ کرے گا تو شاید اس کے لیے مشکل ہو، اس لیے تمام مدارس کو مل کر اس پر غور کرنا چاہیے اور عملی قدم اٹھانا چاہیے۔

جیسے تبلیغ والے کہتے ہیں کہ جان، مال اور وقت کی قربانی، جب ان تین چیزوں کی قربانی کسی چیز پر لگتی ہے تو اس چیز کی قدر و قیمت کا احساس دل میں پیدا ہوتا ہے۔ جب ہر چیز کی ذمے داری مہتمم، مدرسے اور انتظامیہ پر ہے، طالب علم کے اور اس کے والدین کے دماغ پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ہے تو میرا چھوٹا سا اور ناقص سا تجربہ یہ ہے کہ اس سے سیکھنے سکھانے کا جو عمل ہے اور خاص طور پر سیکھنے کا جو جذبہ ہے، وہ بھی خاصے متاثر ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کرنا ہے، کسی اور نے کرنا ہے، ہماری کوئی ذمے داری نہیں۔

غور طلب پہلو

ایک اور پہلو سے میں سوچ رہا تھا کہ فرض کیجیے ایک درمیانے درجے کا مدرسہ ہے، جس میں ایک ہزار طلبہ ہیں، تو اگر وہ طلبہ سے ماہانہ صرف ۵۰۰ روپے لینا شروع کر دیں تو بڑی رقم جمع ہو سکتی ہے۔ ایک طالب علم کے لیے پانچ سو روپے بہت زیادہ نہیں ہیں، اور جو اتنے گئے گزرے ہوں جو پانچ سو بھی ماہانہ نہیں دے سکتے، ان کو معاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارے مدارس میں ایک طالب علم مہنگا ترین موبائل جیب میں لیے پھر رہا ہے اور روٹی مفت کھا رہا ہے، اس پر بہر حال ہمیں نظر ثانی کرنا چاہیے۔ اگر صرف پانچ سو روپے یہ مدرسہ ہر طالب علم سے

لینے لگے تو اس کا مطلب ہے کہ ہر مہینے ۵ لاکھ جمع ہو جائیں گے، اور پانچ کو اگر بارہ سے ضرب دیں تو سالانہ ساٹھ لاکھ بن جائیں گے، اور اگر دو مہینے چھٹیوں کے نکال بھی لیں تو پچاس لاکھ تو کہیں نہیں گئے اور اگر کسی مدرسے کی خالص آمدن پچاس لاکھ ہوگی تو تدریسی عمل میں بہتری کے ہمارے، بہت سے کام جو محض وسائل نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہو پاتے، وہ ہو سکیں گے۔

ہم کلاس رومز کو بہتر بنا سکتے ہیں، گرمی سردی کے اعتبار سے ان کے ماحول کو بہتر بنا سکتے ہیں، ہر ہر کلاس روم میں پروجیکٹر مہیا کر سکتے ہیں، فرنیچر اور دیگر ضروریات کے لحاظ سے کلاس کا ماحول بہتر بنا سکتے ہیں۔ ہم اگر یہ فیصلہ کر لیں کہ اس فیس سے حاصل ہونے والا پیسہ دیگر اخراجات پر نہیں لگانا، بل کہ اضافی چیزوں یا ویلیو ایڈیشن پر لگانا ہے تو کتنا فرق رونما ہو جائے گا۔ اساتذہ کو مطمئن کرنے کے لیے اس میں تکافل طرز کی کوئی اسکیم ہم بنا سکتے ہیں۔ اساتذہ کی ہیلتھ، فیملی ہیلتھ، ان کے بچوں کی تعلیم کے حوالے سے کچھ کر سکتے ہیں، جس سے اساتذہ کو ذہنی سکون ملے گا۔ طالب علم پر ایک چھوٹا سا پانچ سو کا بوجھ پڑے گا لیکن اس سے ہم پچاس ساٹھ لاکھ حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ تو درمیانے درجے کے مدرسے کی بات ہے، لیکن جو مدرسہ دو ہزار یا تین ہزار طلبہ کی تعداد رکھتا ہے، اس کی آمدن تو کہیں زیادہ ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مفت تعلیم وطعام کی روایت بالکل ہی ختم ہونی چاہیے، لیکن بہ ہر حال تھوڑا سا اس حوالے سے اگر غور کر لیا جائے تو میرا اندازہ ہے کہ طلبہ کے رویوں میں بھی بہتری آئے گی اور اس سے مدارس کے بہت سے کام بہتر ہو جائیں گے۔

مدارس اور تدریس کے عمل کو بہتر بنانے کے سلسلے میں اہل مدارس سے ہمیں یہ گزارش بھی کرنی چاہیے کہ تعلیمی معیارات کو نظر انداز نہ کریں۔ قابل اساتذہ کے بغیر اعلیٰ درجات کی کلاسیں شروع نہ کریں۔ ہمارے ہاں عملی صورت حال یہ ہے کہ جو فرد مدرسہ قائم کرتا ہے، اگر فرض کریں کہ درجہ اولیٰ سے شروع کرتا ہے تو وہ لازمی سمجھتا ہے کہ اگلے سال درجہ ثانیہ بھی شروع کرنا ہے اور پھر ہر سال ایک ایک درجہ بڑھانا اور آٹھ سال میں دورۂ حدیث تک پہنچنا ہے۔ بل کہ دورۂ حدیث تو اب معمولی چیز رہ گئی ہے، تخصص تک پہنچنا ہر مدرسہ اپنی ذمے داری سمجھتا ہے۔ اگر کسی مدرسے کے پاس معیاری اساتذہ نہیں ہیں جو اعلیٰ درجے پڑھا سکیں تو

کوئی ضروری نہیں ہے کہ طلبہ کو گھیر گھار کر اپنے پاس رکھیں اور کسی دوسرے مدرسے میں نہ جانے دیں۔ اب تو چھوٹے چھوٹے شہروں میں دورۂ حدیث ہو رہے ہیں۔ اور ماشاء اللہ مفتی صاحبان اتنے زیادہ بن رہے ہیں کہ اب ان کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔ ہمارے بڑے بھائی صاحب بتا رہے تھے کہ ایک صاحب کہنے لگے کہ ہمارا ایک مدرسہ ہے، الحمدللہ تحفیظ کا درجہ تو بہت کامیاب ہوگیا ہے، اب ہم چاہتے ہیں کہ افتا کا کورس شروع کروائیں۔ اس طرح ہم اپنے طرزِ عمل سے اپنا علمی وقار ختم کرتے جا رہے ہیں۔ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے۔

موثر تدریس

موثر تدریس کے حوالے سے میرے سامنے ایک سوال یہ پیش کیا گیا تھا کہ موضوع پر گرفت اور اندازِ تدریس کے علاوہ اور کون سی چیزیں ہیں، جو استاد کے اثرات کو طلبہ کی طرف زیادہ منتقل کرتی ہیں؟ تو حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا جواب وہی ہے، جو مجھ سے پہلے مولانا زاہد الراشدی ارشاد فرما چکے ہیں، یعنی وقت کی پابندی اور انضباط۔ الحمدللہ شروع ہی سے مدارس کے ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ ہم نے یہ دیکھا کہ جو استاد وقت کا پابند ہے، وقت پر آتا ہے، وقت پر جاتا ہے، نہ دیر سے آنے کا عادی ہے، نہ جلدی جانے یا دیر سے جانے کا عادی ہے، اس کی ایک خاص شخصیت ہوتی ہے، مدرسے کے ماحول پر اس کا ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ حتیٰ کے جو ان کے شاگرد نہیں بھی ہوتے، ان پر بھی خاص اثر ہوتا ہے۔

ہمیں اپنا بچپن کا دور یاد ہے، ہمارا بچپن جامعہ خیر المدارس (ملتان) میں گزرا۔ ہمارے والد صاحب وہاں پڑھاتے تھے۔ حضرت قاری رحیم بخش رحمہ اللہ تعالیٰ قرأت وحفظ کے صدر مدرس تھے، درجۂ کتب کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن ان کی وقت کی پابندی ضرب المثل تھی اور ناغہ وہ بالکل بھی نہیں کرتے تھے۔ اگر حج سے آئے ہیں اور کراچی سے ملتان ریل صبح فجر کے وقت پہنچی ہے، تو گھر جانے کے بہ جائے سیدھا درس گاہ میں آئیں گے، اور پھر وہاں پڑھا کر ظہر کے بعد گھر جائیں گے۔

اسی طرح مدرسے اور ماحول کا احترام اور ادب بھی بہت ضروری ہے۔ بڑے بڑے اساتذہ بھی مدرسے کے ادب کا اہتمام کرتے تھے۔ مدرسے کے اندر سائیکل پر یا کسی اور چیز

پر سوار ہونا بے ادبی سمجھی جاتی تھی، اب تو طالب علم بھی ان چیزوں کا خیال نہیں رکھتے۔ قاری صاحب جب تشریف لاتے تو گیٹ پر ہی وہ سائیکل سے اتر جاتے تھے ان کا کوئی شاگرد سائیکل پکڑ کر آگے لے جاتا تھا۔ جوں ہی وہ داخل ہوتے، ایک خاص قسم کا سناٹا چھا جاتا، چاہے وہ مدرسین ہوں، منتہی درجات کے طلبہ ہوں یا چھوٹے درجات کے طلبہ ہوں، سب خاموشی سے ان کی طرف متوجہ ہوجاتے تھے۔ وقت کی پابندی کی برکت سے اللہ جل جلالہ شخصیت کے اندر ایک خاص تاثیر رکھتے ہیں۔ صرف ہیبت نہیں، بل کہ محبوبیت بھی اس کے نتیجے میں پیدا کرتے ہیں، استعداد اور صلاحیت کم ہو، اس کا خلا بھی اللہ جل جلالہ اس وقت کی پابندی کی برکت سے پورا کردیتے ہیں۔ اس لیے اس کا ہمیں خاص اہتمام کرنا چاہیے۔

اندازِ تدریس

انداز تدریس کے حوالے سے چند غیر مربوط سی باتیں ہیں، جو میں آپ کی خدمت میں وقت کی گنجائش کے مطابق عرض کروں گا۔ ایک تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں تدریس میں کتاب پر ارتکاز زیادہ ہوتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بس کتاب حل کرنی ہے، یقیناً یہ بھی ایک مقصود ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ موضوع پڑھانا، متعلقہ علم پڑھانا اور متعلقہ علم کے بارے میں اپنے طلبہ کو تیار کرنا، ان میں استعداد پیدا کرنا، یہ استاد کی اصل ذمے داری ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں نصاب کا بڑا کردار ہے۔ آپ نحو پڑھانے کے لیے شرح جامی کا انتخاب کریں اور وہی نحو پڑھانے کے لیے آپ شرح ابن عقیل کا انتخاب کریں تو دونوں کے نتائج میں زمین وآسمان کا فرق ہوگا۔ کیوں کہ جامی پڑھانے کا ایک خاص انداز ہمارے ہاں مروج ہو چکا ہے۔ کسی استاد کے لیے اس سے ہٹنا انتہائی مشکل ہے، لیکن جیسے مولانا زاہد الراشدی ابھی فرمارہے تھے کہ اگر استاد چاہے تو کوئی بھی کتاب ان کے سامنے رکھ دی جائے، وہ کچھ بھی اس میں سے پڑھا سکتا ہے۔ اس ماحول میں کہ ہمارا نصاب زیادہ سازگار نہیں ہے، استاد کی ذمے داری زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ایک کتاب ہمیں ایک خاص مزاج کی طرف لے جارہی ہے اور مدرسے کا ماحول بھی ہمیں ایک خاص مزاج کی طرف لے کر جارہا ہے، لیکن استاد کی حیثیت سے آپ طالب علم کی شخصیت سازی اور ذہن سازی میں سب سے اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

طلبہ کی تعداد

ضمنی طور پر کلاس میں طلبہ کی تعداد کا مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ کیا ہمیں اتنی بڑی بڑی کلاسیں رکھنی بھی چاہییں یا نہیں؟ کئی کئی سولڑ کے ایک کلاس میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس کی کچھ حد بندی ہونی چاہیے۔ کہاں تک ہونا چاہیے اور کہاں تک نہیں؟ یہ ایک قابل غور مسئلہ ہے۔

اتنی بڑی کلاس کے اندر بعض اوقات ہر طالب علم کی طرف توجہ تو مشکل ہوتی ہے، لیکن جو اچھے اور ذی استعداد طلبہ ہیں، ان کو جب آپ نصاب کی کوئی کتاب پڑھا رہے ہوں تو اس فن کی امہات کتب کے ساتھ بھی اُن کا ایک خاص قسم کا تعلق پیدا کر دیں۔ ان کتب کا تذکرہ کریں، پڑھنے کا شوق دلائیں۔ اگر آپ فقہ پڑھا رہے ہیں تو فقہ کی کئی کتابوں کا تذکرہ آپ کی زبان پر ہو، اگر نحو پڑھا رہے ہیں تو نحو کی امہات کتب کا تذکرہ آپ کریں، اگر آپ مصطلح الحدیث یا شرح نخبۃ پڑھا رہے ہیں تو صرف ان کی بات نہ ہو، بل کہ خطیب بغدادی کی الکفایہ، اسی طرح حاکم کی کتاب، ابن صلاح کی کتاب اور ابن کثیر کی کتاب وغیرہ کا ذکر کریں اور آپ کا طالب علم کم از کم ان کتب کے ناموں سے مانوس ہو چکا ہو۔ اگر آپ قرآن اور تفسیر پڑھا رہے ہیں تو تفسیر کی امہات کتب کے ناموں سے وہ مانوس ہو چکا ہو، اور صرف ناموں سے مانوس نہ ہو بل کہ اسے اچھی لائبریری مہیا کی گئی ہو، آپ چند طلبہ کو کام دیں، اسائمنٹس دیں۔ بڑے سائز کی پوری کلاس کو سنبھالنا تو مشکل ہو جائے گا، چند طلبہ کا انتخاب کیا جا سکتا ہے کہ جو فن آپ پڑھا رہے ہیں، اس حوالے سے چھوٹے چھوٹے کام انہیں دیں، تا کہ وہ امہات الکتب کی طرف خود مراجعت کریں۔ تو آپ دیکھیں گے کہ دورۂ حدیث تک پہنچتے پہنچتے ان کے اندر تحقیق کا خاص مادہ، ایک خاص صلاحیت پیدا ہو جائے گی اور ان کے لیے آگے بڑھنا مشکل نہیں ہوگا۔ ورنہ ہمارے مدارس کے فضلا فارغ ہو کر تخصص کر کے یونی ورسٹیز میں ایم فل تک پہنچ جاتے ہیں، لیکن ان کو تحقیق کی مبادیات کا بھی پتا نہیں ہوتا۔ یہ تو خیر دور کی بات ہے، لیکن علوم اسلامیہ کے جو اہم مراجع ہیں، ان کے بارے میں بھی انہیں کوئی معلومات نہیں ہوتیں۔

جو موضوع آپ پڑھا رہے ہیں، وہ اطلاقی، تطبیقی اور عملی پہلو سے پڑھائیں۔ چاہے وہ صَرف ہو، نحو ہو، فقہ ہو یا اصول الفقہ ہو، طالب علم کے ذہن میں یہ احساس ہو کہ جو کچھ ہم پڑھ

رہے ہیں، یہ محض رٹنے یا امتحان دینے کے لیے نہیں پڑھ رہے، بل کہ کہیں نہ کہیں ان چیزوں کا اطلاق ہوتا ہے۔

ایک دفعہ ہمارے مدرسے میں شرح جامی کے ایک استاد حج پر تشریف لے گئے تو ان کی جگہ کچھ عرصہ مجھے شرح جامی پڑھانی پڑی، یہ عربی گرامر میں نحو کی کتاب ہے۔ آپ حضرات جانتے ہیں کہ نحو میں تنازع الفعلین کی بحث آتی ہے، دو عوامل کا ایک معمول میں تنازع ہو جاتا ہے۔ اس کو طالب علم ہنسی مذاق کی سی ایک چیز سمجھتے ہیں، لیکن طالب علم کو ہم کبھی بھی اہم امور کی طرف توجہ دلانے اور سمجھانے کی کوشش نہیں کرتے کہ اس میں کچھ تو واقعتاً ایسی چیزیں ہیں، جو غیر ضروری ہیں اور بحث میں شامل ہو گئی ہیں، لیکن اس کے علاوہ اس بحث کے بہت سے اعرابی اور دلالی اثرات بھی ہیں، جن کی طرف طالب علم کی توجہ بالکل بھی نہیں کرائی جاتی۔ میں جس زمانے میں ہدایۃ النحو پڑھاتا تھا تو تنازع الفعلین کی باقاعدہ تمرین کراتا تھا۔ یہ تو نہیں کہ دو بندے لڑ پڑے اور بصرہ کے قاضیوں کے پاس گئے اور انہوں نے یہ فیصلہ سنا دیا اور کوفے کے قاضیوں اور نحویوں کے پاس گئے تو انہوں نے دوسرے فریق کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ اب دونوں قاضیوں میں جھگڑا ہو گیا اور آپ ہائی کورٹ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں اور فیصلہ کر رہے ہیں کہ بصریوں کا فیصلہ ٹھیک ہے یا کوفیوں کا۔ اس طرح کا کوئی جھگڑا تو ہے ہی نہیں، بل کہ اس کا ایک عملی اور تطبیقی پہلو ہے۔ اس کو عامل بنائیں گے تو اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے اور دوسرے کو بنائیں گے تو اس کے کیا اثرات ہوں گے؟ بعض اوقات یہ اثرات اعرابی پہلو سے مرتب ہو رہے ہوتے ہیں اور بعض اوقات یہ اثرات دلالی پہلو سے مرتب ہو رہے ہوتے ہیں۔ ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ ہمارے ہاں جو نحو پڑھائی جاتی ہے کہ ایک بڑا وسیع علم ہے۔ ہمارے ہاں ساری توجہ صرف اور صرف اعرابی پہلو پر ہوتی ہے۔ اس کا توصیفی اور دلالی پہلو بھی ہے اور اس کا اسلوبی پہلو بھی ہے، مثال کے طور پر صفت مشبہ ہے، اس میں اعرابی پہلو سے کوئی خاص بات نہیں ہے، لیکن جو مختلف طرق استعمال ہیں، طالب علم کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کو اتنا پتا ہے کہ یہاں پر منصوب ہے، مجرور ہے، مرفوع ہے۔ لیکن کسی جگہ صفت مشبہ یوں استعمال ہو رہی ہے، یا افعل التفضیل یوں استعمال ہو رہا ہے، اس کے استعمال کے تین طریقے ہیں۔ اگر من کے ساتھ استعمال ہو رہا ہے تو یہ مطلب نکلے گا، اضافت کے ساتھ اگر

استعمال ہو رہا ہے تو یہ مطلب نکلے گا۔ اس کا جو دلالت پر اثر پڑتا ہے، اس کی طرف ہم بہت کم توجہ دیتے ہیں۔

ہمارے چھوٹے بھائی مرحوم مفتی محمد مجاہد شہیدؒ نے فقہ کی تدریس میں ایک خاص طریقہ ایجاد کیا تھا، وہ کہا کرتے تھے کہ مثال کے طور پر صاحب قدوری جب جزئیات کی شکل میں کوئی مسئلہ بیان کر رہے ہوتے ہیں تو در حقیقت وہ جزئیہ جو ہوتا ہے، وہ ایک مثال ہوتی ہے، اس کے پیچھے ایک قاعدۂ کلیہ ہوتا ہے، اگر طالب علم کے ذہن میں وہ قاعدۂ کلیہ بٹھا کر صرف کتاب والی مثالیں نہیں، بل کہ آج کے دور کی بھی مزید کچھ مثالیں طالب علم کے سامنے رکھ دی جائیں، تو جو اصل بات ہے، وہ طالب علم کو زیادہ بہتر سمجھ میں آجائے گی اور اس مسئلے کا انطباق اس کے لیے آسان ہو جائے گا۔

مثال کے طور پر کتاب البیوع میں طالب علم پڑھتا ہے

من باع صبرة طعام كل قفيز بدرهم

جس نے غلے کا ایک ڈھیر فی قفیز ایک درھم کے بدلے خریدا

مولف نے اس کی دو تین شکلیں بیان فرمائی ہیں۔

اور

من باع قطيع غنم كل شاة بدرهم

جس نے بکریوں کا ایک ریوڑ فی بکری ایک درھم کے بدلے خریدا۔

اس کی بھی آگے مختلف شکلیں بنائیں ہیں۔ تو دیکھنے میں یہ چند جزئیات ہیں لیکن حقیقت میں یہ جزئیات نہیں ہیں۔ عام طور پر جب ہم قدوری میں یہ متعلقہ جگہ پڑھائیں گے تو ہم کہیں گے کہ مصنف نے یہاں دو تین مسئلے بیان فرمائے ہیں تو ان میں وجہ فرق کیا ہے۔ اب یہ جو ہمارا انداز گفت گو ہے، وہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ہم یہ تاثر دیتے ہیں کہ ہمارے بیچارے مصنف پر کوئی بہت بڑا اعتراض ہو گیا ہے یا وہ دفاعی پوزیشن میں آ گیا ہے، ہمیں اس کی طرف سے دفاع کرنا ہے کہ اس نے ایک جزئی کے ذکر کے بہ جائے تین چار کا ذکر کیوں کر دیا؟ اور اس کی وجہ سے ہماری پوری اپروچ ری ایکٹو بن جاتی ہے۔ ہم نے رد عمل کا اظہار کرنا ہوتا ہے اور دفاع کرنا ہوتا ہے۔ یہاں ہماری مثبت سوچ نہیں ہوتی۔ تو جب بھی کوئی چیز پڑھائیں تو عملی

اعتبار سے یا فکری اعتبار سے یہ بھی بتایں کہ اس چیز کا اطلاق کہاں ہو رہا ہے اور اگر دو باتیں آپ کے سامنے ہیں تو ان سے فرق کیا پڑے گا، عملی طور پر فرق کیا ہوگا؟ یہ بات طالب علم کے سامنے ضرور آنی چاہیے اور اس کے سامنے رکھنی چاہیے۔

متقدمین کی کتب

ہمارے ہاں درس نظامی کی بہت سی کتابیں ایسی ہیں، جو درحقیقت ماضی کا ایک تسلسل ہیں۔ یہ یا تو کسی کتاب کی تلخیص ہیں یا اس پر مبنی ہیں یا کسی کتاب کی شرح ہیں یا شرح کی شرح ہیں۔ ہمارے ہاں درس کی تیاری کے سلسلے میں شروح دیکھنے کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ میں مدرسین سے عرض کیا کرتا ہوں کہ کوئی بھی شرح، کوئی بھی حاشیہ بعد میں دیکھیں، پہلے خود نفسِ کتاب دیکھیں اور اس موضوع پر اپنا ایک ذہن بنائیں، اس کے بعد کوئی شرح اٹھا کر دیکھیں، ورنہ پہلے مرحلے میں ہی اگر آپ شرح یا حاشیہ دیکھ لیں گے تو آپ کا ذہن اسی فریم میں بند ہو جائے گا اور اس سے نکلنا آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا اور آپ کی سوچ وہیں پر جام ہو جائے گی۔ پہلے آپ اپنی سوچ استعمال کریں اور اس کے بعد پھر باقی چیزیں دیکھیں۔ نورالانوار کسی زمانے میں میں پڑھاتا تھا، نورالانوار کی کوئی شرح میرے پاس نہیں تھی، البتہ اصول فقہ کی جو اہم کتابیں ہیں، وہ میں دیکھتا تھا، جو بھی مسئلہ ہو، اس کو پوری طرح پہلے اپنے ذہن میں بٹھا کر غور کرتا تھا، پھر جب کتاب دیکھتا تھا تو کتاب سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ سال ختم ہوا، اگلا سال شروع ہوا، نورالانوار کسی اور استاد کی طرف منتقل ہوگئی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کے پاس اگر نورالانوار کی کوئی شرح ہو تو عنایت کیجیے۔ میں نے کہا کہ میرے پاس تو کوئی شرح نہیں تو وہ بڑے حیران ہوئے کہ شرح کے بغیر کیسے پڑھالیا؟

بات دراصل یہ ہے کہ اگر استاد موضوع پر عبور رکھتا ہو اور اس موضوع کی امہات کتب پر اس کی نظر ہو تو اس کو کسی شرح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسری بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں اور اس سے کم از کم مجھے بڑا فائدہ پہنچا کہ جو کتابیں پچھلی کسی کتاب پر مبنی ہیں، وہاں شرحیں دیکھنے سے زیادہ مفید ہوتا ہے کہ اس سے پچھلی جو چیز ہے، جو اس کی ماں ہے، اس کو آپ ایک نظر دیکھ لیں۔ مثال کے طور پر مشکوٰۃ والے سال میں ہمارے ہاں تفسیر بیضاوی

پڑھائی جاتی ہے۔ اگر آپ ''کشاف'' پڑھنے کے بعد تفسیر بیضاوی دیکھیں تو آپ کو لگے گا کہ تفسیر بیضاوی درحقیقت کشاف کی تلخیص ہے۔ کوئی چیز زائد نہیں ہے۔ سوائے چند مقامات کے کہ جہاں معتزلہ سے اہل سنت والجماعت کا نقطہ نظر مختلف تھا، وہاں کچھ مواد امام بیضاوی نے امام رازی کی ''تفسیر کبیر'' سے لے لیا ہے۔ تو آپ بیضاوی کی شرحیں دیکھنے کے بجائے کشاف کو پہلے دیکھ لیں، اور کشاف کو دیکھ کر بیضاوی کو دیکھیں تو آپ کو بیضاوی سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔

اسی طرح ہمارے ہاں مثال کے طور پر کافیہ پڑھائی جاتی ہے۔ کافیہ درحقیقت زمخشری کی المفصل کی تلخیص ہے۔ آپ زمخشری کی المفصل دیکھ لیں، کافیہ پڑھانے والے اساتذہ کو شوق ہوتا ہے کہ ایسی کتاب اور ایسی شرح ہو، جس میں دقتِ نظر پائی جائے۔ وہ اس ذوق کو پورا کرنے کے لیے مفصل پر ہی ابن یعیش کی شرح ہے ''شرح المفصل لابن یعیش''، اس سے یہ ذوق بھی پورا ہو جائے گا۔ اس کے بعد آپ کافیہ دیکھیں گے تو آپ کے لیے کافیہ کوئی چیز نہیں ہوگی، اور آپ کو پورا پس منظر سمجھ میں آجائے گا کہ اصل بات کیا تھی اور ابن حاجب نے اس کی تلخیص کس انداز سے کی ہے؟ نور الانوار کا متن المنار ہے، اور المنار کی بنیاد اصول بزدوی پر ہے۔ اگر آپ ایک نظر اصول بزدوی کو دیکھنے کے بعد المنار کو دیکھیں تو بات آپ کو پورے طور پر سمجھ میں آجائے گی۔

اسی طرح صاحب ہدایہ نے کیا کام کیا ہے؟ انہوں نے یہ کام کیا ہے کہ اس وقت تک فقہائے حنفیہ نے مختلف مسائل کی جو علتیں اور دلائل ذکر کیے تھے، ان کا انتہائی جامع ومانع، مختصر اور قانونی الفاظ کے اندر خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ ہدایہ کی شرح دیکھیں، فتح القدیر دیکھیں۔ لیکن آپ ایک بار تجربہ کر کے دیکھیں کہ ہدایہ دیکھنے سے پہلے وہی مسئلہ آپ کاسانی کے ہاں دیکھ لیں اور وہی مسئلہ آپ سرخسی کے ہاں دیکھ لیں۔ ان دونوں کو دیکھنے کے بعد آپ اگر ہدایہ دیکھیں گے تو آپ کو ایک خاص قسم کا لطف آئے گا۔ وہی بحث جو آپ نے کاسانی اور سرخسی کے ہاں تفصیل سے دیکھی تھی، ہدایہ کے اندر آپ کو بہت زیادہ اختصار سے ملے گی۔ اس کا جو پس منظر اور ماضی ہے، جتنا آپ اس کی طرف جائیں گے، اتنا ہی علم آپ کے سامنے نکھر کر آئے گا۔ اگر آپ فقہ پڑھا رہے ہیں تو امام محمد کی کتاب دیکھنے کا موقع مل جائے اور امام شافعی

کی کتاب الالام دیکھنے کی اگر آپ کو فرصت مل جائے تو کیا ہی کہنے ہیں۔

حضرت مولانا یوسف بنوریؒ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہمارے کورس میں متاخرین کی کتابیں ہونی ہی نہیں چاہییں، متقدمین کی کتابیں ہی پڑھانی چاہییں۔ لیکن اس پر عمل کہیں بھی نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ ہمارے مدارس کے ماحول میں یہ بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن درس کی تیاری میں آپ یہ کام ضرور کر سکتے ہیں۔ ہم جب کسی کتاب کو حل کرنے بیٹھیں تو عموماً اس سے نیچے کی طرف دیکھتے ہیں، آپ اوپر کی طرف جائیں۔ آپ ہیڈ بلوکی سے نیچے کی طرف جائیں گے تو پانی میں اس کے اثرات آئیں گے، آپ دیکھیں کہ دریائے راوی چلتا کہاں سے ہے؟ جتنا آپ پیچھے جائیں گے، اتنا شفاف پانی ملے گا۔ ہر فن میں، خاص طور پر فقہ میں اس چیز کا ضرور تجربہ کر کے دیکھیں۔ ہمارے ہاں جو فقہی جمود ہے، اس جمود کا توڑ بھی یہی ہے۔ متاخرین کی کتابوں میں تفریعات پر تفریعات ہیں، لہٰذا جو متاخرین کی کتابیں پڑھتا ہے، اس کا ذہن جزئیاتی سا ہو جاتا ہے اور کلیاتی کم ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ پیچھے کی طرف، ماضی کی طرف جائیں گے تو آپ کو انداز ذرا مختلف ملے گا۔

میری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ جس فن کی بھی کتاب آپ پڑھا رہے ہوں، اس کی تیاری کرتے ہوئے اس کی ابتدائی دور کی کتابیں دیکھیے۔ خاص طور پر آپ کے پیش نظر جو کتاب ہے، اس سے پہلے کا جو ذخیرہ ہے، وہ آپ کی نظر میں ضرور ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ایک اور چیز کا اہتمام کر لیں، یعنی کسی بھی مضمون کو زمانی ترتیب کے ساتھ دیکھنے کی عادت اپنائیں۔ خاص طور پر فقہ میں اگر زمانی ترتیب کے ساتھ دیکھیں کہ یہ بات کہاں سے چلی اور صاحب ہدایہ تک کیسے پہنچی، اور صاحب ہدایہ کے زمانے سے چلی اور علامہ شامی کے دور تک کیسے پہنچی۔ بعض اوقات زمانی ترتیب یاد رکھنا مشکل ہو جاتی ہے۔ اب المکتبۃ الشاملۃ کا جو نیا ایڈیشن آیا ہے، انہوں نے الاختیار الرقمی میں ہر موضوع کی کتابیں اسی ترتیب سے دی ہوئی ہیں۔ حدیث میں مصنف کی وفات کی ترتیب سے۔ فقہ میں صدی کے اعتبار سے کتابیں ترتیب سے ملیں گی۔ کسی بھی مسئلے کو اس کے زمانی بہاؤ کے ساتھ دیکھنے کا جو رجحان ہے، وہ ہمارے ہاں نہ ہونے کی وجہ سے بہت ساری پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کے بارے میں ہمیں کچھ توجہ دینی چاہیے۔

تربیت

ایک آدھ بات اور کر کے اپنی گزارشات ختم کرتا ہوں۔ ایک بات تو طلبہ کی تربیت کے حوالے سے ہے۔ ہم تربیت کا مطلب سمجھتے ہیں کہ درس میں تقریریں جھاڑیں اور وعظ ونصیحت کریں۔ ہمارے اکثر بزرگوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وعظ ونصیحت کے حوالے سے مختصر بات ہونی چاہیے، گھنٹہ گھنٹہ تقریریں کرنا، پڑھائی کے لیے مخصوص وقت میں خیانت ہے اور ہمارے والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ عام طور پر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مدرس کی تیاری سبق کے لیے نہیں ہے۔ جس دن وہ مطالعہ نہیں کر سکا، وہ آئے گا اور سب سے پہلے آتے ہی سبق سنے گا اور سبق بھی کسی نالائق طالب علم سے سنے گا، جب وہ نہیں سنا سکے گا تو پھر ڈانٹ ڈپٹ شروع ہو جائے گی اور اسی میں پورا گھنٹہ نکل جائے گا۔

یہ درست ہے کہ دوسرے انسانوں کی طرح استاد کو بھی عوارض پیش آجاتے ہیں، آدمی بیمار ہو جاتا ہے، اسفار پیش آجاتے ہیں، اور گھر میں کام پیش آجاتے ہیں، جن کی وجہ سے آدمی تیاری نہیں کر پاتا۔ اس کا حل بھی ہمارے والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ سبق کی تیاری تقریباً ایک ہفتہ آگے رکھنی چاہیے اور تیاری دو طرح کی ہو، ایک سرسری تیاری، جو روز ہونی چاہیے، اور ایک تیاری آپ کی ایسی ہو جو ایک ہفتہ آگے کی ہو۔ مثلاً آج اگر بدھ ہے تو اگلے بدھ کی تیاری بھی آج ہو۔ البتہ کل جو میں نے پڑھانا ہے، اس کی چوں کہ سات روز قبل میں تیاری کر چکا ہوں، اس لیے اب میں اسے سرسری طور پر دیکھ کر چلا جاؤں گا۔ اس طریقے کا یہ فائدہ ہوگا کہ اگر اگلے منگل یا پیر کو مجھے کوئی ایسا عارضہ پیش آگیا کہ میں تیاری نہیں کر سکا تو یہ نہیں ہوگا کہ میں کسی بہانے سے چاہوں کہ درس میں نہ جاؤں یا اگر جاؤں تو غیر متعلق گفت گو میں وقت کو پورا کرنے کی کوشش کروں۔

اصل تربیت یہ ہے کہ استاد خود عملی نمونہ بنے۔ اس حوالے سے ایک چیز میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، خاص طور پر ہمارے مدارس کے ماحول میں، وہ یہ کہ ہمارے شاگرد اور طلبہ اساتذہ کا بہت ادب اور احترام کرتے ہیں، جو کہ بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے بعض اوقات ہم یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ بہ حیثیت انسان اور بہ حیثیت مسلمان کسی کا جو حق ہوتا ہے، وہ کم از کم طالب علم کے حوالے سے ختم ہو گیا ہے۔ ہمارا بات کرنے کا انداز ایسا ہوتا

ہے، جس میں شاگرد کے لیے تحقیر کا پہلو ہوتا ہے، اس میں ان کی عزتِ نفس کے خیال نہ رکھنے کا پہلو ہوتا ہے، یا انہیں چھوٹی چھوٹی بات پر ڈانٹ دینے کا رویہ ہوتا ہے۔

ایک مدرسے میں ایک واقعہ ہوا، کچھ عرصے قبل کی بات ہے کہ ایک استاد صاحب نے بڑے عجیب وغریب انداز سے کسی کو طالب علم سمجھ کر ڈانٹا، حال آں کہ وہ طالب علم نہیں بل کہ باہر سے آیا ہوا مہمان تھا۔ اس پر اس نے ناراضی کا اظہار کیا تو استاد صاحب نے کہا کہ میں سمجھا آپ مدرسے کے طالب علم ہیں۔ تو اس نوجوان نے کہا کہ معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ اگر آپ کا شاگرد بھی ہو تو کیا شاگردوں سے اس انداز سے بات کی جاتی ہے؟ یہ احساس کرنا ضروری ہے کہ وہ اگر شاگرد ہے تو وہ بھی انسان ہے، اس کی بھی عزتِ نفس ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ طلبہ کے ساتھ رویے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو بہت زیادہ اصولی قسم کا رویہ ہوتا ہے، اگر کسی سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی منطقی نتیجہ نکلنا ہی چاہیے، اس میں نرمی اور لچک کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ دوسرا رویہ ہوتا ہے کہ اگر غلطی میں کسی تاویل کی گنجائش ہے، کوئی شبہ ہے، کوئی عذر ہے، کوئی اصلاح کی گنجائش ہے اور اس میں لچک کے پہلو سے، سمجھانے بجھانے کے انداز سے کام چل جائے تو اس سے فائدہ اٹھالیا جائے۔ بہ ظاہر دونوں ہی رویوں کے اپنے اپنے فوائد ہیں، لیکن اپنی زندگی میں دیکھا کہ دوسرا رویہ زیادہ فائدے مند ہے۔ پہلے رویے کے نتائج عموماً اتنے اچھے نہیں ہوتے، حتیٰ کہ اگر کسی طالب علم کا اخراج کرنا پڑ گیا جو کہ آخری سزا ہوتی ہے تو ہمارے والد صاحب کا طریقہ عموماً یہ ہوتا تھا کہ اس کو بلاتے اور کہتے کہ دیکھیں! یہ بات اور یہ صورت حال ہے، اس میں اب تمہارا یہاں رہنا تمہارے لیے فائدے مند نہیں ہے، اب بہتر ہے کہ تم کسی اور جگہ چلے جاؤ۔ اس سلسلے میں ہماری کسی مدد کی ضرورت ہو تو ہم ضرور کریں گے۔ یہ سمجھا کر اس کو رخصت کر دیتے تھے۔ اس کا عملی نتیجہ ہم نے یہ دیکھا کہ اگر کسی کو خارج بھی کیا ہے تو وہ آپ کا دشمن بن کر نہیں نکلے گا۔ اس کے دل میں آپ کے لیے محبت موجود ہوگی، اور اگر آپ بے عزت کر کے وہاں سے نکال دیں گے تو صرف آپ کے مدرسے کے نہیں بل کہ تمام مدارس کے بارے میں اس کا ذہنی رویہ عجیب قسم کا ہو جائے گا۔ ان گزارشات پر میں اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین